ڈاکٹر ارشد معراج
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

آزادیٔ اظہار کے جدید تصورات

Dr. Arshad Meraj
Asstt. Prof. Department of Urdu,
International Islamic University, Islamabad

The Modern Concepts of Freedom of Expression

Freedom of Expression is a very burning issue especially in the 21 century. This is an issue of immense topical value in these times of intolerance and extremism in a society like Pakistan. In this article, modern thoughts about the freedom of expression related to literature have been discussed since freedom of expression is central to literature and literary studies.

ہر شہری کو تقریر کرنے اور آزادی سے اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق حاصل ہو گا۔ پریس آزاد ہو گا۔ یہ آزادیاں ان معقول پابندیوں کے تابع ہوں گی، جو عظمت اسلام، ملک کی سالمیت یا ملکی دفاع یا غیر ممالک سے دوستانہ تعلقات یا امنِ عامہ یا اخلاقیات کے تحفظ یا توہینِ عدالت یا جُرم کے ارتکاب کو روکنے یا اس کی ترغیب کے امکانات کے پیشِ نظر قانون کے مطابق عائد کی جائیں گی۔[1]

''آئینِ پاکستان'' [آرٹیکل ۔۱۹]

ہر شخص کو رائے رکھنے اور ظاہر کرنے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ ہر شخص آزادی کے ساتھ، بغیر کسی قسم کی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہ سکے اور جس ذریعے سے بھی چاہے، ملکی سرحدوں سے بالاتر ہو کر خیالات و معلومات کی جستجو کر سکے، وصول کر سکے، ارسال کر سکے۔[2]

''انسانی حقوق کا عالمی اعلان نامہ'' [آرٹیکل ۔۱۹]

آزادیٔ اظہار انسان کا اساسی اور امتیازی حق ہے اس کے بغیر انسان کے دوسرے حقوق خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ جیسا کہ

نیوزی لینڈ کے فاضل جج اینڈرسن نے ہوسکنگ (Hosking) بنام رنٹنگ (Rounting) کے مقدمہ میں کہا:

Freedom of expression is the first and last trench in the protection of liberty. [۳]

آزادیٔ اظہار انسانی حریت کے لیے پہلا اور آخری مورچہ ہے۔

آزادیٔ اظہار کے بارے میں مباحث روز بروز بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور اس کی ہمہ جہت توسیع ہوتی جا رہی ہے۔ اس میں انسانی ترقی کے پسِ پردہ عوامل درج ذیل ہیں۔

۱۔ تکنیکی ایجادات اور عالمی میڈیا

۲۔ اجتماعی کوششیں اور معیارات

۳۔ سیاسی و قانونی جدوجہد

آزادیٔ اظہار میں حقوق اور فرائض (فرد اور معاشرے دونوں کے) شامل ہیں لیکن ان کو بنیادی طور پر حقوق کے ذیل میں رکھ کر بحث کی گئی ہے۔ کسی بھی نفرت انگیز تقریر کے متاثرہ افراد کی کسی حد تک تلافی کی جا سکتی ہے۔ اگر یہ نفرت والی تقریر قانونی طور پر قابلِ مواخذہ سطح سے کم تر درجے پر ہو اور جدید معاشرہ آزادیٔ اظہار کے حوالے سے اس سماجی ذمہ داری سے کیسے عہدہ برآ ہوسکتا ہے؟

آزادیٔ اظہار کے ضمن میں سب سے مؤثر قانونی مآخذ بین الاقوامی انسانی حقوق کا اعلان نامہ ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ آرٹیکل ۔۱۹ کی رُو سے:

۱۔ ہر شخص کو آراء رکھنے کا اختیار ہوگا اور اس سلسلے میں کوئی مداخلت نہ ہوگی۔

۲۔ ہر شخص کو آزادیٔ اظہار حاصل ہوگی۔ اس حق میں ہر طرح کے نظریات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اور معلومات دوسروں تک پہنچانے کی آزادی شامل ہوگی۔ سرحدیں اس حق کی راہ میں حائل نہ ہوں گی۔ یہ معلومات تحریری شکل میں، زبانی شکل میں یا کسی آرٹ کی شکل یا کسی اور مطلوبہ ذریعے حاصل کی جا سکیں گی۔

۳۔ شق نمبر۲ میں درج حق کی بجاآوری کے دوران خاص فرائض اور ذمہ داریاں لاگو ہوں گی لہٰذا اس ضمن میں کچھ پابندیاں بھی عائد ہوسکتی ہیں لیکن صرف وہ پابندیاں لاگو ہوں گی کہ جن کا قانون میں ذکر ہے اور ضروری سمجھی جائیں گی۔

الف۔ دوسروں کی عزت، شہرت اور حقوق سے متصادم نہ ہوں۔

ب۔ قومی سلامتی، امنِ عامہ، صحت عامہ یا اخلاقِ عامہ متاثر ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

شق نمبر۲ میں مذکورہ آزادیٔ اظہار کے سلسلے میں معلومات، خیالات او رآراء کو دوسروں تک بغیر کسی مداخلت کے پہنچانا، چاہے کسی

بھی مواد پر مبنی ہوں۔ مواد کا غیر جانبدار ہونا، بالفاظ دیگر آزادئ اظہار ہر اساسی اصول کے طور پر کسی رائے، پیغام کی نوعیت کی بنیاد پر نہیں روکا جا سکتا۔

یہ حق نہ صرف نظریات کے مواد اور فراہم کردہ معلومات کو تحفظ دیتا ہے بلکہ اُن ذرائع کو بھی تحفظ دیتا ہے کہ جس کے توسط سے یہ نظریات اور معلومات دوسروں تک منتقل کی جائیں۔ انسانی حقوق کے بین الاقوامی اعلان نامہ کی رُو سے آزادئ اظہار کی ضمانت ہر ایک شخص کو حاصل ہے کہ وہ اپنے خیالات، اپنی آراء اور اپنے معتقدات چاہے وہ مذاقِ عامہ یا رائے عامہ سے متصادم ہوں، رکھ سکتا ہے اور پھیلا سکتا ہے۔ یہ آزادئ اظہار کا دوہرا پہلو ہے جو بیک وقت جہاں فرد کے حقوق کی توثیق کرتا ہے وہیں کہتا ہے کہ کوئی شخص کسی کی آزادی پر کوئی قدغن نہیں لگا سکتا اور ہر طرح کی معلومات ،نظریات جس کا دوسرے اظہار کریں، تک رسائی کا اجتماعی حق رکھتا ہے۔ اظہار صرف الفاظ تک محدود نہیں، اس میں علامتی اظہار بشمول جسمانی حرکات اور مخصوص رویّہ بھی شامل ہے۔

آزادئ اظہار کے زمرے میں قلیل تعداد رکھنے والے گروہ بھی اُسی طرح کے حقوق اور ذمہ داریاں رکھتے ہیں جس قدر کہ اکثریت کا حق ہے۔ سیاسی استصواب جابرانہ ریاستی طاقت اور تعلیمی نظام کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے اور ''اتفاقِ رائے'' تو بذاتِ خود اشرافیہ کا اقلیتی آراء کو دبانے کا ایک حربہ ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ (آراء) اکثریت کی ہے یا اقلیت کی۔

اس سلسلہ میں جمہوریت کو اہمیت حاصل ہے کیونکہ اکثریتی رائے ہی فیصلے کا تعین کرتی ہے لیکن جمہوریت اپنی اصل روح میں صرف اکثریت کے شاندار مظاہرے کا نام نہیں (جمہوریت میں) اقلیتی نکتہ نظر کے بارے میں بھی ہمدردانہ رویّہ پایا جاتا ہے۔ حالانکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مختلف پلیٹ فارم پر اقلیتی آوازوں کو دبا دیا جاتا ہے اور ذرائع ابلاغ میں ایسے نکتہ نظر کو نمایاں نہیں کیا جاتا ۔ نیوزی لینڈ کے جسٹس گولٹ نے ہوسکنگ بنام رننگ کے مقدمہ میں کہا ہے:

> Although the right of freedom of expression is not in every case the ace of trumps, it is a powerfull card to which the courts of this country must always pay appropriate respect. [۴]
>
> اگرچہ آزادئ اظہار کا حق ہر مقدمے کی صورت میں ترپ کے پتے کی حیثیت نہیں رکھتا لیکن یہ ایک طاقتور پتہ ہے۔ ہمارے ملک کی عدالتوں کو چاہیے کہ ہمیشہ اس کا مناسب احترام کریں۔

اسی سلسلے میں برٹرینڈ رسل اپنے مضمون ''آزادی اور معاشرہ'' میں لکھتے ہیں: فرد کی آزادی کا احترام وہاں ہونا چاہیے جہاں اُس کے اعمال سے دوسروں کو کوئی براہِ راست واضح اور غیر مشکوک نقصان نہیں پہنچتا۔[۵]

انسانی حقوق و فرائض کے وسیع تر تناظر میں اس برابری کے بنیادی خیال کو سامنے لانا چاہیے جو انسانی حقوق کے بنیادی ڈھانچے کے گرد گھومتا ہے۔ قانون ساز اداروں سے یہ مطالبہ کیا جانا چاہیئے کہ ریاست میں قومی، نسلی، مذہبی نفرت انگیزی جو انسانوں

کے درمیان امتیاز اور تفریق معاندانہ رویے اور تشدد کا سبب بنتی ہے پر مکمل پابندی لگائیں۔ انسانی حقوق کے ایکٹ HRA مجریہ ۱۹۳۳ء کی دفعہ ۶۱ اُس اظہار پر پابندی عائد کرتی ہے جو کسی کو خوفزدہ کرے جس میں ناشائستہ زبان استعمال ہو، جو کسی کے لیے توہین آمیز ہو، جس کے بارے میں یہ یقین ہو کہ وہ کسی شخص یا کسی گروہ کے لیے ان کے رنگ ونسل، مذہبی یا قومی بنیادوں پر ان کے لیے اشتعال انگیز ہوگا۔

سیکشن/ دفعہ ۱۳۱ دفعہ ۶۱ کی طرح ہی مجرمانہ فعل کی تعریف کرتی ہے لیکن اس میں یہ اضافی الفاظ آتے ہیں کہ کسی کے بارے میں اشتعال انگیزی کا ارادہ یا کسی سے خلاف بدنیتی یا ارادہ توہین شامل ہیں۔ نسلی تعلقات کے ایکٹ مجریہ ۱۹۷۱ء کی رو سے نسلی عدم توازن کی طرف انگیخت دلانا مجرمانہ فعل قرار دیا گیا ہے۔

نیوزی لینڈ کے بروز (Burrows) کے مطابق آزادئ اظہار کے مہیا کرنے کے عمل میں توازن برقرار رکھنا مشکل ترین امر ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> If you don't regulate enough, unquestionably people can be hurt, If you're too free, you can damage society, you can damage individuals. At the other end, if you're too regulated and too restricted, the public aren't given the information they need. It is the most difficult area in the whole of the law to get right. There are just so many cross currents, so many important interests in it, that to strike the correct balance that will please everybody is virtually impossible. [۲]

> اگر آپ معقول حد تک کنٹرول نہیں کرتے تو یقیناً لوگوں کو صدمہ پہنچ سکتا ہے اور اگر آپ بہت زیادہ آزادی دیں تو آپ معاشرے کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ آپ افراد کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ دوسری طرف اگر بہت سی پابندیوں کا شکار ہوں گے تو عوام کو مطلوبہ اطلاعات میّسر نہیں ہوں گی۔ اِس قانون کا یہ حصّہ بے اندازہ مشکلات رکھتا ہے جہاں اس توازن پر پہنچا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں بہت سے مخالف تموجات پائے جاتے ہیں۔ بہت سے اہم مفادات پیوستہ ہوتے ہیں، صحیح ترین توازن پر پہنچنا کہ جو ہر ایک کو خوش کر سکے بدیہی طور پر ناممکن ہے۔

لیکن اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہے کہ آزادئ اظہار کے حق سے دستبردار ہو جائیں بلکہ اِس امر میں مزید غوروفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی جکڑ بند معاشرے میں آزادئ اظہار ناممکن سا عمل ہے کیونکہ ایسے معاشرے میں نئے خیالات و افکار قائم نہیں ہو سکتے اور جاری و مروّجہ افکار کی بالادستی حکمران طبقہ قائم رکھنا چاہتا ہے کیونکہ انہیں نئے افکار ناقبول ہوتے ہیں کیونکہ نئے افکار کے ساتھ ہی تبدیلی کا عمل بھی شروع ہو جاتا ہے اس لئے ایسا ماحول پیدا کیا جاتا ہے کہ لوگ بادشاہ کے خلاف سوچنا تک گناہ سمجھیں اس طرح

یہ ادارہ ایک Taboo (تحریم) کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اس قدر طویل ہوتا ہے کہ لوگ نفسیاتی طور پر غلامی اختیار کر لیتے ہیں لیکن کہیں نہ کہیں افکار کی آزادی کا یہ دروازہ کھولنا پڑتا ہے کیونکہ آبادیاں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہیں اور وسائل بھی بڑھتے ہیں تو سماجی مسائل بھی بڑھتے ہیں۔ سماجی مسائل کا حل سیاسی تبدیلیوں سے ممکن ہوسکتا ہے۔ سیاسی تبدیلی کا براہِ راست تعلق معاشی تبدیلی سے ہے اس لئے افکار کی آزادی جمہوری بن جاتی ہے۔ لوگ ہر وہ چیز جو اُن کے مسائل کا سبب ہوتی ہے، اُن کی شعور سازی میں مدد دیتی ہے پھر یہ عمل صرف تجزیاتی صورت میں نہیں رہتا بلکہ افکار کا روپ دھارتا ہے اور اپنے افکار کے ذریعے سماج کی تبدیلی کے لئے سماج کو اپنے افکار سے آگاہ کرتا ہے۔ افکار و خیالات کی اِس آزادی کے بارے میں برٹرینڈرسل کہتے ہیں''ہمارے خیالات کی آزادی سے فن اور فلسفے کی پوری دنیا ہی پیدانہیں ہوتی بلکہ حُسن کا وژن بھی جنم لیتا ہے۔''[۷] خیالات کی تازگی ہی افکار کی آبیاری کرتی ہے اور خیالات کی پنیری، فلسفہ وفکر، علم و دانش اور آگہی کے ساتھ مل کر حسنِ زندگی کی راہ پاتے ہیں۔

بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جس میں ایک محدود پیمانے پر احرار کی قائم کی جاسکتی ہے۔ لوگوں کو اپنے افکار کا ہم خیال بنایا جاسکتا ہے۔ بعض باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو افکار کی روایت کو چیلنج کرتی ہیں اِس سلسلے میں فکر کی آزادی سے پہلے اظہار کی آزادی کی ضرورت ہوتی ہے گویا فکر کی آزادی اظہار کی آزادی کے ساتھ مشروط ہے۔ آزادیٔ اظہار کے ذریعے فرد کی اصلاح کا مسئلہ اور اجتماعی ہمواری کا مسئلہ حل ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ میں بنجمن این کارڈوز کہتے ہیں:

> Freedom of expression is the matrix, the indispensable condition of nearly every other form of freedom. [۸]

آزادیٔ اظہار ایک سانچہ ہے اور تقریباً ہر دوسری قسم کی آزادی کے لئے ایک ناگزیر شرط ہے۔

اقدار اور روایات کے متوازی ایک نیا فکری جہان قائم کرنا لازمی جزو ہے کیونکہ اس کا مخاطب براہِ راست سماج ہوتا ہے۔ یہ معاشی تاریخی روایات کو چیلنج کرتی ہیں اور افکار و خیالات کی قبولیت کے لئے آمادگی پیدا کرتی ہیں۔ آمادگی اس لئے قائم ہوتی ہے کیونکہ مخصوص سیاسی سماجی نظام میں رہ کر مسائل کا حل نہیں نکلتا اسی لیے نئے فکری رجحان کے لیے آمادگی پیدا ہوتی ہے۔ اس جنگ میں پہلا مرحلہ سیاسی جدوجہد کے ذریعے معاشی اور سماجی مسائل کو نئی تفہیم دینا ہے۔ حکمران طبقات اِس سلسلہ میں شدید مزاحمت کا مظاہر کرتے ہیں لیکن قانون متحرک ہو تو لوگوں کو راستہ میّسر آ جاتا ہے سیاسی جدوجہد کے ذریعے وہ قربانیاں دیتے ہیں اور تبدیلی کے خواہاں ہوتے ہیں اور رسل کے مطابق یہ تقاضا کرتے ہیں''ہماری خواہشیں اگر دوسروں کے لیے تباہ کن اور خطرناک نہ ہوں تو پھر انہیں آزادانہ اظہار کا موقع ملنا چاہیے۔''[۹]

سماج کی فکری اور مادی نشوونما آزادیٔ اظہار کے بغیر ممکن نہیں۔ پوری انسانی تاریخ اِس امر کی گواہ ہے کسی بھی دور میں انسان خاموش تماشائی نہیں رہا۔۔۔وہ تاریخ کے منظرنامے کا سٹیریوٹائپ کردار نہیں ہوتا کہ جس کی کہانی محض مروّجہ اخلاقیات، Taboos (تحریمات) اور روایات لکھتے ہیں بلکہ مسائل کے حوالے سے اِن کرداروں کا تجزیاتی ذہن خود اپنے کردار کی نوعیت کو بدل دینے کا

شدید خواہش مند ہوتا ہے۔ یہ انفرادی اور قومی سطح پر تاریخی حوالوں سے ایک فرد یا افراد یا اقوام کا تاریخی مرحلہ ہوتا ہے۔ اس طرح افکار اپنے اظہار کی کامل آزادی کے بغیر اپنے اس تنقیدی، تجزیاتی اور تخلیقی شعور کی بیداری کو عمل میں نہیں لا سکتے۔ اگر عملی شکل نہ دی جا سکے تو انسان بے بسی اور مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسان کی سماجی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ وہ بہت عرصہ ذلّت اور مقہوری کی زندگی بسر نہیں کر سکتا لہٰذا نتائج کی پرواہ کئے بغیر سقراط، افلاطون، ارسطو، کارل مارکس، ڈارون اور فرائیڈ جیسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ البرٹ آئن سٹائن لکھتے ہیں:

> Everything that is really great and inspiring is created by the individual who can labour in freedom.[۱۰]

ہر تخلیق واقعتاً عظیم ہے اور جوش و جذبے کو اُبھارتی ہے اگر تخلیق کار آزادی کے ساتھ تخلیقی مشق میں کوشاں رہتا ہے۔

خالص سیاسی طور پر حسّاس شخصیت وہ ہوتی ہے جو اپنے اظہار میں کسی بھی اقلیت کا دِل نہ دکھائے یا ان کے تحفظات کا خیال رکھے۔ وہ ایسی رائے کا اظہار کرے جو سب کے لیے ممکن ہو۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ اپنی رائے کا اظہار کریں اور وہ سب کے لئے قابلِ قبول ہو۔ اس صورتِ حال میں آپ کی کوئی رائے نہیں ہو گی۔ اگر سچ بولنے کی نصیحت ایک آفاقی سچائی ہے اگر انفرادی طور پر یہ رائے دی جائے تو یہ ذاتی مسئلہ ہو گا لیکن اجتماعی طور پر اگر کسی خاص نقطے پر کچھ لوگ جمع ہوتے ہیں تو خاص قسم کی رائے رکھنے کے باوجود ان کی رائے کے مخالف رائے نہیں دیں گے۔

ایسی سوسائٹی جہاں لوگ سیاسی طور پر درست رہنا چاہتے ہیں وہاں ایک مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں تبدیلی واقع نہیں ہوسکتی کیونکہ موجودہ شکل کی تبدیلی ہی ارتقائی مراحل ہوتے ہیں تاکہ اپنے نقطۂ آغاز پیش کرنے کے عمل میں گرم جوشی کو ختم کرنا ضروری ہے۔ یہاں آپ کا ایک دائرہ ہے جس میں رہتے ہوئے آپ آزاد ہیں۔

سیاسی حساس شخصیت ایسے الفاظ، محاورات اور اسباب جن سے دوسرے گروہوں کی دِل آزاری ہو انہیں استعمال کرنے میں احتیاط برتتے ہیں۔ بہترین اخلاقیات وہ ہے جو دوسرے کو کم سے کم نقصان پہنچاتی ہیں اور آپ کی رائے بھی قائم رہتی ہے اس لیے انسان دوست اور ذاتی مفادات کو منہا کر کے ہی کسی کی رائے کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں حکومتِ وقت کے قائم کردہ حصار کے باوجود اُن کی پالیسیوں کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ۔۔۔رہا سماجی ذمہ داری کے سلسلہ میں حکومت کا سوال تو یہاں اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ حکومتِ وقت سے اختلاف کرنا یا اس کا مذاق اڑانا یا اُس سے انحراف کرنا وطن دشمنی نہیں ہے اور نہ ہی غداری۔ یہی وہ چیز ہے جسے ہم اصطلاح میں ''آزادئ اظہار'' کا نام دیتے ہیں۔[۱۱]

آزادئ اظہار دراصل وہ بنیادی انسانی حق اور وسیلہ ہے کہ جس کے ذریعے ادب و فنون لطیفہ ترقی کرتے ہیں۔ انسان

دوست مفکر کارلس لیمانٹ کے بقول:

"The humanist stress on complete cultural democracy and freedom of expression. It means that artists and writers should have the widest latitude in what they produce and say. A free literature is an absolute essential for a free culture.[۱۲]

انسان دوست (گروہ) ثقافتی جمہوریت اور آزادی اظہار پر مکمل زور دیتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ فنکار اور ادیب کہ جو وہ تخلیق کرتے ہیں یا وہ کچھ کہ جو کہتے ہیں وسیع تناظر کا حامل ہونا چاہیے۔ ایک مکمل غیر جانبدار ادب آزاد ثقافت کے لیے انتہائی ناگزیر ہے۔

اسی ضمن میں ڈاکٹر صلاح الدین درویش کہتے ہیں''غرض آزادیٔ اظہار کا حق تمام تر انسانی حقوق کے حصول کا بنیادی سرچشمہ ہے اور ادب آزادیٔ اظہار کے بنیادی انسانی حق کا مؤثر وسیلہ ہے۔''[۱۳]

اگر تمام لوگ بجز ایک شخص کے ایک رائے ہوں اور صرف ایک شخص دوسری رائے رکھتا ہو تو اِس صورت میں وہ تمام لوگ بھی اس ایک شخص کے بہ جبر زبان بند کرنے میں اس قدر برسرِحق ہوں گے جس قدر کہ وہ ایک شخص بشرط قدرت ان تمام لوگوں کے خاموش کرنے میں ہوتا۔ کسی رائے کو روکنے میں جو مخصوص خرابی ہوتی ہے وہ یہ کہ اس سے کُل بنی نوع انسان کا نقصان ہوتا ہے خواہ وہ موجودہ نسل ہو یا آنے والی نسلیں ہوں اس میں اُن کا نقصان بھی ہے جو رائے صحیح ہے تو وہ اپنی غلطی کی تصحیح کرنے کے موقع سے محروم رہتے ہیں۔ اگر غلط ہے تو وہ صحت کے واضح تر تخیل سے سچ اور غلطی کے تصادم سے پیدا ہوتا ہے، ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور یہ تقریباً اسی قدر نفع بخش ہے۔ جس رائے کے جبراً روکے جانے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ بہت ممکن ہے کہ صحیح ہو اِسی میں شبہ نہیں کہ جو لوگ اسے روکنا چاہتے ہیں وہ اس کی صحت کے لیے فکر مند ہوتے ہیں لیکن وہ کچھ غیر خطا پذیر نہیں ہیں۔ انھیں یہ کوئی حق نہیں کہ وہ کسی مسئلہ کا فیصلہ کریں اور دوسرے لوگوں کو اِس کے متعلق اظہارِ رائے کا حق نہ دیں۔

بڑے بڑے مطلق العنان سلاطین یا وہ لوگ جو خوشامد کے عادی ہوتے ہیں۔ انھیں تقریباً تمام معاملات میں اپنی رائے پر ایسا ہی اعتماد کلی ہوتا ہے لیکن جو لوگ ان سے بہتر حالت میں ہیں اور جنہیں اپنی آرا پر بحث و حجت کے سننے کا موقع ملتا ہے اور جس وقت ان کی غلطی ثابت ہو جاتی ہے وہ اسے تسلیم بھی کر لیتے ہیں۔ وہ اِس قسم کا اعتماد کلی اپنی صرف اُن آرا کے متعلق رکھتے ہیں جن میں ان کے گردوپیش کے لوگ ان کے ہمنوا ہوں۔ جان اسٹورٹ مِل کنفیوشس کے بارے میں لکھتے ہیں:

کنفیوشس کی تمام تعلیمات کا لبِ لباب ان چند لفظوں میں ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جماعت ایک فرمانِ الٰہی ہے اور یہ پانچ قسم کے تعلقات پر قائم ہے۔ حاکم و رعایا، پدروفرزند، زن و خاوند، برادر و اغیار۔ ان میں حاکم، پدر، خاوند

اور برادر کا حق ہے امرا اور رعایا، فرزند، زن اور برادر کا فرض ہے اطاعت۔ حکم دینے والوں کو چاہیے کہ وہ حق اور انصاف سے کام لیں اور اسی طرح اطاعت کرنے والوں پر بھی فرض ہے کہ وہ حق اور انصاف کو ملحوظ رکھیں۔ دوستوں میں مساویانہ تعلقات ہونے چاہئیں جو حق اور نیکی پر قائم ہوں۔[۱۴]

حیاتِ انسانی کے اغراض کے لیے جتنے یقین کی ضرورت ہے وہ موجود ہے۔ ہمیں اپنے اعمال و افعال کے لئے اپنی رائے کو صحیح ماننا نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری ہے اور جب ہم آدمیوں کو ایسی آرا کی اشاعت سے روکتے ہیں جنہیں ہم جماعت کے لیے مضر سمجھتے ہیں تو بھی ہم کچھ اس سے زیادہ فرض نہیں کرتے۔ جان اسٹورٹ مِل کے بقول:

اپنی رائے کو رد کرنے والا غلط ثابت کرنے کی پوری آزادی دینا ہی تو ایک ایسی شرط ہے جس سے ہم عمل کی بجا طور پر اسے صحیح تسلیم کر سکتے ہیں اور اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہیں ہے جس کی بناء پر کوئی انسانی عقل وفہم رکھنے والا اپنی رائے کے صحیح ہونے کا کوئی معقول اطمینان کر سکے۔[۱۵]

جب ہم رائے کی تاریخ یا انسانی زندگی کی عام حالت پر غور کرتے ہیں تو ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ان کی حالت جیسی بھی ہے اس سے بدتر کیوں نہیں ہے؟ یہ تو یقین ہے کہ یہ فہم انسان کی فطری قوت کا نتیجہ نہیں ہے کیوں کہ کسی ایک معاملہ میں جو بالکل بدیہی نہیں ہے، ننانوے اشخاص ایسے ہیں جو اس پر خود بخود فیصلہ کرنے کے قابل نہیں بلکہ صرف ایک ہوتا ہے جو اس قابل ہوتا ہے اور اس سویں شخص کی قابلیت بھی اضافی ہوتی ہے۔

اس امر سے یہ قضیہ سامنے آتا ہے کہ انفرادی حیثیت اجتماعی حیثیت سے زیادہ اہم مقام رکھتی ہے لیکن ایک سو کے مقابلے میں ایک غلط یا ذاتی عناد کی رائے/ خیال رکھ سکتا ہے۔

سیاسیات میں یہ ایک تقریباً مسلمہ سی بات ہے کہ ایک جماعت جو نظامِ دامن کی حامی ہو اور دوسری جو ترقی و اصلاح کی علمبردار ہو دونوں سیاسی زندگی کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں تاوقتیکہ اِن میں سے ایک اس قدر وسیع النظر نہ ہو جائے کہ وہ نظام اور ترقی دونوں کی یکساں حامی ہو اور یہ سمجھتی ہو کہ کونسی چیز باقی رکھنے کے لائق ہے اور کونسی دور کر دینے کے قابل۔ ان دونوں خیالات میں سے ہر ایک کا افادہ دوسری کی خامی سے پیدا ہوتا ہے لیکن بڑی حد تک دوسرے خیال کی مخالفت ہی دونوں کو عقل وصحت کے حدود میں رکھتی ہے جب تک کہ جمہوریت و اشرافیت، سرمایہ داری و مساوات دولت، تعاون باہمی و مقابلہ، تعیش و اعتدال، اجتماعیت و انفرادیت، آزادی و انضباط اور ایسی قسم کی عملی زندگی کے تمام اضداد کی موافقت و مخالفت میں یکساں طور پر آزادی کے ساتھ خیالات ظاہر نہ کئے جائیں اور ان کی اُسی شدّت اور خوبی کے ساتھ مخالفت نہ کی جائے جیسی کہ موافقت ہو، اس وقت تک ان کا پوار پورا حق ادا نہیں ہوسکتا یقینی ہے کہ ایک کا پلّہ ہلکا ہو جائے گا اور دوسرے کا بھاری۔ حقیقت اصل زندگی کے بڑے بڑے عملی معاملات میں زیادہ تر اضداد کے باہم اتفاق و اتحاد اور اختلاط و ارتباط کا نام ہے یہاں تک کہ بہت کم لوگوں کے دماغ اس قدر وسیع اور بے لوث ہوتے ہیں جو یہ اختلاط وارتباط کسی قدر صحت کے ساتھ پیدا کر سکیں اور یہ پیدا بھی اُسی وقت ہوتا

ہے جب کہ ہر دو فریق ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوں۔محمد حسن عسکری آزادیٔ اظہار کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اظہار پر پابندیاں خواہ حکومت لگائے یا کوئی جماعت یا کوئی طاقت اور فرد لیکن اگر سماج میں رہنے والے افراد کو یہ پابندیاں کسی نہ کسی ڈر سے یا لحاظ کی وجہ سے یا احتراماً اور عقیدتاً قبول کرنا پڑتی ہیں تو نتیجہ بہرصورت یکساں ہوں گا۔ یہاں مجھے پابندیاں لگانے والے کی نیت سے بھی سروکار نہیں ہے۔ اضافی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ارادہ تو ہر ایک کا ہی نیک ہوتا ہے لیکن جیسا کسی نے کہا ہے جہنم کا راستہ نیک ارادے ہی ہموار کرتے ہیں۔ اس کے لیے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ اظہار پر پابندیاں کس نے عائد کی ہیں اور کیوں کی ہیں۔ بحث تو اِن نتائج سے ہے جو فرد کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔[۱۶]

اگر اظہار پر پابندیاں لگائی جائیں تو پہلا صدمہ فرد کو یہ پہنچتا ہے کہ جس شرط پر اِس سماج میں اس کی زندگی ممکن تھی وہ پوری نہیں ہو رہی۔ اس مایوسی کے دو نتیجے ہو سکتے ہیں یا تو یہ کہ فرد اس سماج کے خلاف بغاوت کر دے مگر یہ ایک خطرناک فعل ہے۔ اس کے نتیجے کے متعلق پہلے سے کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی تشدد کا نتیجہ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ یا تو سماج میں انتشار پھیلے یا پھر بہت ہی بے حیا قسم کی مطلق العنان حکومت قائم ہو جائے۔ بغاوت کے علاوہ دوسرا ردِعمل یہ ہے کہ فرد اپنے آپ کو سماج سے بالکل الگ کرے اور اجتماعی معاملات میں دلچسپی لینا چھوڑ دے اور صرف اپنے لیے زندہ رہے اور وہ بھی بہت چھوٹے معنوں میں یعنی اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے کی حد تک یا زیادہ سے زیادہ دولت اور طاقت اپنے قبضے میں لانے کی حد تک اس طرزِ عمل سے اجتماعی زندگی کو نقصان پہنچیں گے تو وہ الگ رہے کیونکہ دوسرے لوگوں کے ساتھ رہنے کے معنی ہیں اشتراک۔ صرف مادی چیزوں میں اشتراک نہیں بلکہ جذباتی اعتبار سے بھی ہر آدمی چاہتا ہے کہ دوسروں کو اس پر اعتماد ہو۔ دوسرے اس سے محبت کریں لیکن جب فرد نے اپنے آپ کو دوسروں سے الگ کر لیا ہو تو نہ تو وہ دوسروں کو اپنا اعتماد اور محبت دے سکتا ہے نہ دوسروں سے اس کی توقع رکھ سکتا ہے۔ اگر ایک فرد کے مفاد دوسروں سے وابستہ نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے اس کے دشمن ہیں۔ جس سماج میں افراد اپنا نامیاتی رشتہ بھُول گئے ہوں، وہاں دولت یا طاقت کا حصول بھی فرد کو اطمینان نہیں بخش سکتا جب لوگ اپنی اجتماعی زندگی اور اس کی تشکیل کے بارے میں آزادی سے بحث نہ کر سکیں تو پھر وہ ایک دوسرے پر اور اس کی نیت پر شک کرنے لگتے ہیں۔ اس شک کا دائرہ بڑھتے بڑھتے ذاتی تعلقات تک پہنچ جاتا ہے جو نہ محبت کے تعلقات رہتے ہیں نہ نفرت کے بلکہ گھٹے گھٹے شکوک وشبہات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ آخر میں جا کر پھر سماجی انتشار سے مل جاتا ہے۔ بقول وجاہت مسعود:

> آزادی اظہار کا معیار یہ ہے کہ اپنے ضمیر کی روشنی میں صحیح مقام پر اپنی حقیقی رائے کا اعلان بلاخوف وخطر کیا جائے۔ ایسی آواز بھلے صحرا میں اذان ہو مگر بہار کی آمد کا اعلان تو خزاں زدہ ٹہنی والی کونپل ہی کرتی ہے۔ سرسبز پیڑوں پر بیٹھی آکاس بیل نہیں۔[۱۷]

فرض کیجیے ہم جس رائے کو بند کرنا چاہتے ہیں حقیقت میں وہ رائے صحیح و درست ہے اور جو لوگ اس کا انسداد چاہتے ہیں وہ

اس کی درستی اور صحت سے منکر ہیں مگر غور کرنا چاہیے کہ وہ لوگ یعنی اُس رائے کے بند کرنے والے ایسے نہیں ہیں جن سے غلطی اور خطا ہونی ممکن نہ ہو تو اُن کو اِس بات کا حق نہیں ہے کہ وہ اُس خاص معاملے کو تمام انسانوں کے لیے خود فیصلہ کریں اور شخصیتوں کو اپنی رائے کام میں لانے سے محدود کر دیں۔ سرسیّد احمد خان لکھتے ہیں:

> کسی مخالف رائے کی سماعت سے اس وجہ سے انکار کرنا کہ ہم کو اُس کے غلط ہونے کا یقین ہے۔ گویا یہ کہنا ہے کہ ہمارا یقین، یقین کامل کا رتبہ رکھتا ہے اور اُس پر بحث و گفتگو کی ممانعت کرنا انبیاء سے بھی بڑھ کر اپنا رتبہ ٹھہرانا ہے اور اپنے تئیں ایسا سمجھنا ہے کہ ہم سے سہو و خطا کا ہونا ناممکن ہے۔۱۸

جو لوگ دولت و منصب اور حکومت یا علم کے سبب غیر محدود تعظیم و ادب کے عادی ہوتے ہیں وہ تمام معاملات میں اپنی آرا کے صحیح ہونے پر یقین کامل رکھتے ہیں اور اپنے اندر سہو و خطا ہونے کا احتمال بھی نہیں کرتے اور جو لوگ اُن سے کسی قدر زیادہ خوش نصیب ہیں، یعنی وہ کبھی کبھی اپنی آراء پر اعتراض، حجت اور تکرار ہوتے ہوئے سنتے ہیں اور کچھ کچھ اس بات کے عادی ہوتے ہیں کہ جب غلطی پر ہوں تو متنبہ ہونے پر اُس کو چھوڑ دیں اور درست بات کو مان لیں۔ اگر انہیں اپنی ہر رائے پر یقینِ کامل تو نہیں ہوتا لیکن اِن آراء کی درستگی پر یقین ہوتا ہے جن کو وہ لوگ جو اُن کے اردگرد رہتے ہیں یا ایسے لوگ جن کی بات کو وہ نہایت ادب و تعظیم کے قابل سمجھتے ہیں ان آراء کو تسلیم کرتے ہیں۔ ایک باقاعدہ کلیہ ہے کہ جو شخص جس قدر اپنی رائے پر اعتماد نہیں رکھتا وہ شخص اسی قدر دنیا کی رائے پر عموماً زیادہ تر اعتماد رکھتا ہے جس کو بعضی اصطلاحوں میں جمہور کی رائے یا جمہور کا مذہب کہا جاتا ہے۔ بقول سلیم احمد:

> اہم اجتماعی مسائل کی آپ کوئی بھی فہرست تیار کیجئے۔ اس میں آزادئ رائے کا مسئلہ اگر سرِ فہرست نہیں تو شاملِ فہرست ضرور ہوگا لیکن آزادئ رائے کے معنی کیا ہیں۔ ایک مکان بنانا چاہتا ہوں میری خواہش ہے کہ مکان میں کم از کم پانچ کمرے بنوائے جائیں اور صدر دروازہ مشرق کی طرف ہو۔ آپ کہتے ہیں کہ زمین تنہا تمہاری نہیں ہے میری بھی ہے اس لیے مکان کا نقشہ میری مرضی سے تیار ہوگا۔ ٹھیک ہے ہم دونوں کو اپنی اپنی رائے پر قائم رہنے کا حق ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنا اپنا نقشہ زمین کے دوسرے شراکت داروں کے پاس لے جائیں پھر جس نقشہ پر اکثریت متفق ہو جائے اس پر مکان کی تعمیر کی جائے۔ قومی تعمیر میں آزادئ رائے کا یہی مفہوم ہے۔۱۹

سرسیّد حالی اور ان کے رفقاء نے کفر کا فتویٰ کا مقابلہ آزادئ اظہار کے سر پر ہی سے کیا۔ دلیل میں ایسے لوگوں کے واقعات پیش کیے گئے جنھوں نے نامساعد حالات میں ایسی بات کہنے یا کرنے کی کوشش کی جسے حکومت یا عوام یا علماء تسلیم نہ کرتے ہوں۔ اس سلسلہ میں محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

> چونکہ لوگ سیاست کے متعلق کھلے بندوں بحث کرتے ہوئے گھبراتے ہیں کیونکہ حکومت پر اعتراض کرتے ہی آدمی کمیونسٹ بن جاتا ہے۔ پھر وہ معاملہ بھی ہے کہ پیراں نمی پرند مریداں می پرانند، حکومت کے چھوٹے چھوٹے افسر سوئی کا بھالا بناتے ہیں اور اپنی خیر خواہی جتانے کو زیادہ سے زیادہ کمیونسٹ دریافت کرتے ہیں۔ غرض چاہے

اظہار پر پابندی ہو یا نہ ہو۔ لوگ اس حق سے کام لیتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ملک کی سیاست پر آزادی سے بحث کرنے کا دروازہ بند ہو گیا تو انسان میں اپنی اجتماعی زندگی میں دلچسپی لینے کا جو فطری رجحان ہوتا ہے اس نے یہ خوفناک راستہ نکالا۔۔۔ کہ چھوٹی چھوٹی بحثیں اتنی شدت اختیار کر گئیں کہ معلوم ہوتا ہے ملک کے سامنے کوئی اور اہم مسئلہ ہے ہی نہیں۔[۲۰]

آزادئ اظہار کا اُصول نئے معاشرہ کا اُصول ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو اسی اصول کی مدد سے ہم ''شاہی'' زمانہ سے ''جمہوری'' میں داخل ہوئے ہیں۔ بظاہر معمولی سے دو لفظوں کے ردّوبدل سے ہماری زمین اور آسمان کس طرح بدل گئے۔ اس کا اندازہ لگانا بھی آسان نہیں رہا۔ جمہوری نظامِ ملک کے تمام پرانے اداروں کی موت تھا۔ حکومت یا معاشرے کا اجتماعی نظام کے بارے میں بنیادی تصوّر بدل جائے تو گھر کا نظام اپنے آپ بدل جاتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں ''بادشاہ'' معزول ہوتا ہے اور گھر میں ''باپ'' کی حکومت بھی اپنے آپ ختم ہو جاتی ہے۔ ریاستی جبر کے خلاف ڈاکٹر سلیم اختر سارتر کے نقطۂ نظر کو یوں بیان کرتے ہیں:

سارتر جس بے باکی سے حکومت کو ہدفِ تنقید بناتا رہا وہ بھی سب پر عیاں ہے اور اِس تنقید کے معاملے کتنا بے باک بلکہ تلخ تھا۔ اس سے بھی سب آگاہ ہیں حتیٰ کہ اُس نے نوبل پرائز لینے سے انکار کر دیا تو یہ الجزائر پر اپنے مؤقف کی بنا پر تھا۔ الجزائر کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی سے اِس دہریہ ادیب کی اس شدید دلچسپی سے جہاں اس کی انسان دوستی کا ثبوت ہے وہاں انعام نہ لینے سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ دل کا کتنا غنی تھا۔[۲۱]

بریخت نے بھی انسانی حقوق کے حوالے سے فاشزم کی مخالفت کی ہے۔ وہ شخصیت پرستی کی مخالفت کرتے ہیں کیونکہ جن معاشروں میں شخصیتیں چھا جاتی ہیں۔ وہاں لوگوں کی تخلیقی صلاحیتیں دب جاتی ہیں۔ جس طرح ایک چھاؤں دار درخت کے نیچے اور کوئی پودا یا درخت سرسبز نہیں رہتا یہی صورت حال عظیم شخصیتوں کی تشکیل سے ہوتی ہے۔ بریخت ''سچ کہنے کی پانچ مشکلات'' میں کہتے ہیں:

آج کے زمانہ میں اگر کوئی جھوٹ اور جہالت کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہے اور سچ لکھنا چاہتا ہے تو اسے کم از کم پانچ مشکلات پر قابو پانا ہوگا۔ اس کے لیے لازمی ہوگا کہ جرأت مند ہو تاکہ سچ لکھ سکے اور کسی کے دباؤ میں نہیں آئے۔ ہوشیار ہو تاکہ اپنی بات خوبصورتی سے کہہ سکے۔ فن میں ماہر ہو، اپنے فیصلے کا اظہار اس طرح کرے کہ جو مؤثر ہو، اس میں چالاکی بھی ہو کہ سچ کہے اور پکڑا نہ جائے۔ سچ کہنے کی یہ پانچ مشکلات فاشسٹ حکومتوں میں بہت زیادہ ہوتی ہیں خاص طور پر اُن کے لئے جو ان حکومتوں کے اندر رہتے ہیں حالانکہ وہ جلاوطن ہیں یا ملک سے بھاگے ہوئے ہیں۔ انھیں بھی اِن مشکلات سے سابقہ پڑتا ہے بلکہ وہ لوگ بھی اس سے دو چار ہوتے ہیں جو کہ نام نہاد بورژوا آزادی والے ملکوں میں رہتے ہیں۔[۲۲]

جو شخص آزادئ اظہار کو اپنا نا چاہتا ہے وہ نہ تو کسی کے دباؤ میں آنا پسند کرتا ہے اور نہ ہی خاموش رہنا اور نہ ہی وہ جھوٹ بات کہنا چاہتا ہے اس لئے سچ کہنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ یہ نہ سوچے کہ اپنے سچ سے صرف طاقتور کو جھکائے، بلکہ یہ

سوچے کہ اپنے عمل سے کمزور کو دھوکہ نہ دے۔ اس طرح جرات کے ساتھ نچلے طبقوں کی بات کرے اور ان کی محرومیوں کو سامنے لے کر آئے۔ بریخت کا کہنا ہے:

> سچائی کو لکھنے کے لئے صرف جرأت ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ ایک اور چیز جو بہت ضروری ہے وہ یہ کہ سچائی کو کس طرح سے تلاش کیا جائے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ سچائی کو پانا کوئی سہل کام نہیں ہے دوسرے یہ بھی کوئی آسان بات نہیں کہ اِس بات کا فیصلہ کیا جائے کہ کون سا سچ ایسا ہے جس کو بیان کیا جائے اور جس کے بیان کرنے سے کچھ فائدہ ہوگا مثلاً یہ تو سب کو معلوم ہے کہ کس طرح دنیا کی بڑی بڑی مہذب ریاستیں وحشی قبیلوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکیں اور ختم ہوگئیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ خانہ جنگی جو مہلک ہتھیاروں سے لڑی جاتی ہے، اپنے پیچھے انتشار اور لاتعداد مسائل چھوڑ جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سچائی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اور سچائیاں ہیں مثلاً یہ کہ کرسی کی سطح برابر ہوتی ہے اور یہ کہ بارش اوپر سے نیچے کی جانب ہوتی ہے۔ اکثر شاعر اسی قسم کی سچائی لکھتے ہیں اور یہی حال آرٹسٹوں کا ہے جو ایک ڈوبتے ہوئے جہاز کی تصویر بناتے ہیں اور اپنے عمل سے طاقتوروں کو ناراض نہیں کرتے اور یہی لوگ اپنی تصویریں مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے یہ لوگ سچائی کو نہیں پا سکتے۔ ۲۳

ایسے لوگ بھی ہیں جو نہ تو طاقتور سے ڈرتے ہیں، اور نہ غربت و مفلسی سے خوف کھاتے ہیں لیکن اس کے باوجود سچائی کو نہیں پاسکتے۔ دراصل ان میں علم کی کمی ہوتی ہے اور یہ قدیم توہمات میں گرفتار رہتے ہیں ان کے لئے دنیا ایک پیچیدہ چیز ہوتی ہے اس لئے نہ تو وہ واقعات سے واقف ہوتے ہیں اور نہ اِن کے باہمی اثرات سے اس لئے اس وقت کے تمام لکھنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ زمانہ کی تبدیلی، مادی، جدلیاتی عمل، معاشیات اور تاریخ سے واقف ہوں جو کتابوں اور عملی تجربات سے سیکھتا ہے وہی کئی سچائیوں کو اُجاگر کرسکتا ہے۔

سچائی کے لئے ضروری ہے کہ اسے لکھنے اور پڑھنے والا دونوں ہی پہچان سکیں۔ اگر کوئی سچ بولے، تو سچ سننے والے بھی موجود ہونے چاہئیں اس لئے لکھنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ وہ کس کے لئے لکھ رہے ہیں۔ ہمیں خراب صورت حال پر اس وقت لکھنا چاہیے جب ہمیں اُس کا تجربہ ہو اور ان لوگوں کو مخاطب کیا جائے جو مسائل سے گھرے ہوئے ہوں۔ سچائی جنگ لڑنے والی چیز ہے کیونکہ یہ نہ صرف جھوٹ کیخلاف لڑتی ہے بلکہ ان انسانوں کیخلاف بھی جو جھوٹ پھیلاتے ہیں۔ بریخت لکھتے ہیں ''جب سچائی کو دبایا اور چھپایا جاتا ہے تو اسے بیان کرنے کے لئے چالاکی کی ضرورت ہوتی ہے۔ الفاظ کا صحیح استعمال سچائی کو ظاہر کرتا ہے اور جھوٹ کا پردہ چاک کرتا ہے۔'' ۲۴

اس سلسلے میں بریخت مثالیں دیتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں جب عوام (Folks) کی جگہ قوم اور زمین کی جگہ جائیداد کی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں تو یہ گمراہی کی جانب لے جاتی ہیں کیونکہ لفظ عوام ایک اتحاد اور اکائی کی علامت ہے اور اجتماعی دلچسپی کو ظاہر کرتا ہے جب کہ قومیں ایک ہی ملک میں کئی ہوتیں ہیں اور اُن کے مفادات بھی ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہیں اور یہ سچائی ہے کہ جسے چھپایا جاتا ہے اسی طرح جب زمین کی خوشبو کی بات کی جاتی ہے تو یہ حکمرانوں کا جھوٹ ہوتا ہے کیونکہ

اس میں عوام کی محبت شامل نہیں ہوتی بلکہ اس سے مراد اناج کی قیمت اور محنت کی قیمت ہوتی ہے جو زمین کی محنت سے فائدہ اٹھاتے ہیں، وہ لوگ ہیں جو خود اناج پیدا نہیں کر سکتے اور زمین کی خوشبو ان کے پہیوں کے مقابلے میں دب جاتی ہے اور وہ اس خوشبو کی بجائے کچھ اور ہی سونگھتے ہیں اس لیے زمین کے بجائے جائیداد یا قبضہ زمین صحیح لفظ ہے کیونکہ اس سے آدمی کو دھوکہ نہیں ہوتا۔ ان ملکوں میں جہاں آمرانہ طرزِ حکومت ہو وہاں 'تنظیم' کی جگہ 'فرماں برداری' لکھنا چاہیے کیونکہ تنظیم تو بغیر حکمران کے بھی ممکن ہے۔ لکھنے والا الفاظ کی تبدیلی کے ذریعے بہ آسانی اپنی بات کہہ سکتا ہے مثلاً انگلستان کے ٹامس مور نے ایک ایسی یوٹوپیا کا نقشہ کھینچا کہ جہاں انصاف کا دور دورہ تھا اور وہ اس سرزمین سے مختلف تھی جہاں وہ رہ رہا تھا لیکن حالات کے لحاظ سے وہ اس سے ملتی جلتی تھی۔ لینن جسے زار کی پولیس نے تنگ کر رکھا تھا اس نے روسی بورژوا استحصال اور ظلم کو جو انھوں نے جزیرہ زخالین میں کر رکھا تھا، اس طرح بیان کیا کہ اس نے روس کی جگہ ''جاپان'' اور زخالین کی جگہ ''کوریا'' لکھا اور پڑھنے والوں کو جاپانی نظام میں روسی استحصالی طریقے نظر آئے جو وہ زخالین میں استعمال کر رہے تھے۔ یہ تحریر ممنوع قرار نہیں دی گئی کیونکہ اس وقت جاپان روس کا دشمن تھا اس لئے جو بات جرمنی میں رہتے ہوئے جرمنی کے بارے میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ وہ بات آسٹریا کے بارے میں لکھ کر کی جا سکتی ہے۔ والیٹر نے چرچ اور اعتقادات اور معجزوں کے خلاف جنگ لڑی، لینن نے ایک نوجوان خاتون پر نظم لکھی اور اس معجزہ کا ذکر کیا کہ یوہانا فوجیوں اور راہبوں کے درمیان ایک مدت رہی اور اس کے باوجود وہ کنواری کی کنواری رہی۔ شیکسپیئر کے ہاں بھی چالاکی کا ایک نمونہ ہم اس تقریر میں دیکھتے ہیں جو انطونیو نے سیزر کی لاش پر کی۔ وہ بار بار اس بات کو دہراتا ہے کہ سیزر کا قاتل ''بروٹس'' ایک قابلِ احترام شخص ہے لیکن پھر وہ اس قتل کے عمل کو بھی دہراتا ہے اور اس کا یہ بیان مؤثر ہوتا ہے۔ ایک مصری شاعر نے جو چار ہزار سال قبل گزار ہے، سچ کہنے کے لئے اس نے بھی اس قسم کے طریقے استعمال کئے تھے۔ اس کا دور طبقاتی کشمکش کا اہم دور تھا اور حکمران عوامی طبقے عوامی دباؤ میں آئے ہوئے تھے اس موقع پر دربار میں ایک دانش مند آتا ہے اور حکمران اور امراء کے سامنے اندرونی دشمنوں اور خطرات سے انہیں آگاہ کرتا ہے، اپنے طویل بیان میں وہ اس بے چینی کا ذکر کرتا ہے جو نچلے طبقوں میں پائی جاتی تھی۔ اس کا بیان اس قسم کا ہے اور یہ اس طرح ہے کہ اونچے لوگ شکایتیں کر رہے ہیں جب کہ نچلے طبقوں کے لوگ خوشی سے بھرپور ہیں۔ ہر شخص یہ کہتا ہے کہ ہم اپنے شہر کے طاقتوروں کو نکال باہر کرنا چاہتے ہیں۔

قصہ مختصر ہم ان پانچ مشکلات کو بریخت کے مطابق ایک مقصد کے لئے استعمال کریں، اور سچائی کو اس انداز میں کہیں کہ دشمن اسے نہ پا سکے اور سچ کہنے والے کو نہ روک سکے۔

انسانی سماج میں خواہ وہ قدیم دور ہو یا جدید انسان کے بے شمار حقوق میں آزادئ اظہار کا حق سب سے زیادہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔ قدیم تہذیبوں میں اس اہم مسئلہ کی طرف کم توجہ کی گئی ہے مگر جدید عہد میں اس امر کی ضرورت کو خاص طور پر محسوس کیا گیا اور ''انسانی حقوق کا اعلامیہ'' اور ''آئین پاکستان'' میں آزادئ اظہار کے حوالے سے تفصلاً درج کیا گیا۔ اس سلسلہ میں جو قوانین مرتب کیے گئے ان میں اقلیت کی آواز اور انفرادی رائے کی اہمیت پر زور دیا گیا اور ریاستی جبر اور سماجی و معاشرتی دباؤ کی مذمت کی گئی ہے لہذا یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آزادئ اظہار فرد کا بنیادی اور ناقابل انتقال حق ہے۔

حوالہ جات

۱۔ آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان،تعارف وتشریح،زاہد حسین انجمن،منصور بک ہاؤس لاہور۱۹۹۲ء،آرٹیکل نمبر۱۹

۲۔ اقوام متحدہ انسانی حقوق کا بین الاقوامی منشور ترجمہ پاکستان: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق، لاہور

۳۔ http://www.FOE/Freedom-NZLR.htm.p1

۴۔ http://www.FOE/Freedom-NZLR.htm.pp5

۵۔ برٹنڈر رسل: رسل کے مضامین، مترجم قاضی جاوید، تالیف ڈاکٹر نعیم احمد، گورا پبلشر، لاہور۱۹۹۴ء،ص:۷۷

۶۔ http://www.FoE/Freedom-NLR-htm, p-8

۷۔ برٹنڈر رسل: رسل کے مضامین،ص:۷۷

۸۔ ibid

۹۔ برٹنڈر رسل: رسل کے مضامین،ص:۷۷

۱۰۔ http:FOE/Freedom-wikiquote-htm,p-1

۱۱۔ جمیل جالبی،تنقید اور تجزیہ، یونیورسل بکس، لاہور،۱۹۸۸ء،ص: ۶۵

12. Corliss lamont, the philospy of Humanism, The continum Publishing Com,New York, 1993, P.275

۱۳۔ صلاح الدین درویش، ڈاکٹر، اُردو ناول میں انسانی حقوق اور طبقاتی کشمکش کا شعور، جنرل آف ریسرچ، ولیم 9، فیکلٹی آف لینگویج اینڈ اسلامک سٹڈیز، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۶ء،ص: ۱۸۳

۱۴۔ جان اسٹورٹ مِل ،آزادی، مترجم سعید انصاری،اردو اکیڈمی سندھ، کراچی مئی ۱۹۶۵ء،ص: ۲۲۔۱۲۳

۱۵۔ ایضاً،ص: ۲۴۔۱۲۵

۱۶۔ محمد حسن عسکری، مقالاتِ محمد حسن عسکری، تحقیق و تدوین، شیما مجید،علم وعرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۱ء،ص:۵۹

۱۷۔ وجاہت مسعود، نصابِ گُل، ڈیموکریٹک کمیشن فار ہیومن ڈویلپمنٹ، لاہور، اپریل ۲۰۰۵ء،ص: ۱۷

۱۸۔ سرسیّد احمد خان، مقالاتِ سرسید، مجلس ترقی ادب ، لاہور، طبع دوم، جلد پنجم، اپریل ۱۹۹۰ء،ص:۲۱۶

۱۹۔ سلیم احمد، آزادی رائے کو بھونکنے دو، مشمولہ ادھوری جدیدیت، سفینہ اکیڈمی کراچی، طبع اوّل، ۱۹۷۷ء،ص:۸۸

۲۰۔ محمد حسن عسکری، مقالاتِ محمد حسن عسکری،ص:۶۱

۲۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ادیب اور آزادئ اظہار، مشمولہ دستاویز، راولپنڈی، ۱۹۸۷ء،ص: ۲۴۹

۲۲۔ بریخت، برٹولٹ، سچ کہنے کی پانچ مشکلات، مشمولہ،ملحد کا اوورکوٹ، مترجم ڈاکٹر مبارک علی، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۶ء،ص:۱۱

۲۳۔ ایضاً،ص:۱۲

۲۴۔ ایضاً،ص۱۴